حیاتِ اخروی
کے چند مختلف مظاہر

از

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی رحمہ اللہ

پس منظر: تحریر نگار کے پچھلے مضمون "حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" پر اٹھنے والے علمی و فکری سوالات کے تشفی بخش جواب کے طور پر اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کی اصولی رہنمائی رہنمائی و حکم کے تحت لکھا گیا ایک تفصیلی اور تحقیقی مقالہ

ماہنامہ دار العلوم دیو بند

جون، جولائی 1954ء

پہلی قسط:-

حیاتِ اُخروی کے چند مختلف مظاہر

(از مولٰنا اخلاق حسین قاسمی الدہلوی، فاضل دیوبند)

"حیات النبی" کے عنوان سے میرا ایک مقالہ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کے "دار العلوم" میں چھپا تھا، جس میں حیات النبیؐ متعلق علماء متقدمین و متاخرین کی مختلف توضیحات و تفسیرات پیش کی گئی تھیں۔

اس مقالہ کی اشاعت پر ایک طرف تو یہ ہوا کہ مخدومی حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی زید مجدہم نے شائع شدہ مضمون سے پیدا ہونے والے بعض اہم سوالات کی طرف احقر کو متوجہ فرمایا، اور حکم دیا کہ اس موضوع کو ان اصولی لائنوں پر ترتیب دو تاکہ کوئی عقلی اور نقلی الجھاؤ پیدا نہ ہو۔

دوسری طرف مولٰنا سید محمد اظہر شاہ صاحب قیصر نے بعض ناظرین دار العلوم کے خطوط میرے پاس بھیجے، جن میں بعض دوستوں نے حیات اُخروی کے متعلق کچھ باتیں معلوم کیں اور کچھ اعتراضات بھی کئے۔

اس تحریک پر حیات اُخروی سے متعلق یہ مختصر مقالہ ترتیب دے کر ناظرین دار العلوم کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔"

(اخلاق حسین قاسمی الدہلوی)

قرآنِ حکیم کے نزدیک حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے دنیا کی موجودہ زندگی کو تو قرآن عارضی زندگی کہتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف تمام آسمانی کتابوں نے انسان کو متوجہ کیا ہے

وان الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان (عنکبوت) "اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندگی"

مادہ پرست ملحدوں سے اسی بات پر اسلام کا جھگڑا ہے وہ کہتے ہیں جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر۔ "اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سو زمانہ ہمیں مارتا ہے"

قرآنِ حکیم نے اس کے جواب میں کہا، کہ نہیں، موت کے بعد زندگی ہے، جس زندگی میں تم اپنے کئے کا پھل پاؤ گے۔

قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم ثم یجمعکم الی یوم القیامۃ "تو کہہ اللہ ہی جلاتا ہے تم کو پھر مارے گا تم کو پھر زندہ کر کے اکٹھا کرے گا تم کو قیامت کے دن"

مطلب یہ کہ موت کے بعد تم فنا ہو کر حساب کتاب سے نہیں چھوٹ سکتے۔ بلکہ زندہ رہتے ہو، موت تو صرف دنیا سے منتقل ہونے کا نام ہے۔

کچھ رُوح کے متعلق

اصل مسئلہ جس سے آگے بحث کرنی ہے چونکہ عالم روحانیات سے متعلق ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رُوح کے بارے میں چند باتیں واضح کر دی جائیں:-

(۱) انسان نام ہے کثیف مادہ (جسم) اور جوہر مجرد (رُوح) کے مجموعہ کا، یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ گویا ایک ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے متاثر ہوتا ہے۔

(۲) :— ادراک کرنا مادہ کا کام نہیں، یہ کام جوہرِ مجرّد یعنی رُوح کا ہے۔

(۳) :— رُوح عالمِ کثیف کی چیزوں کا عموماً حواس یعنی کان آنکھوں اور ناک وغیرہ کے ذریعہ ادراک کرتی ہے۔ لیکن عالمِ لطیف کی چیزوں کے ادراک میں وہ حواس کی محتاج نہیں ہے، ان کا ادراک وہ خود بخود کرتی ہے۔

(۴) :— انسان مر کر نیست و نابود نہیں ہوتا، بلکہ وہ جوہرِ لطیف جو اس پیکرِ خاکی میں بولتا چالتا اور تکلیف و راحت محسوس کرتا ہے اپنے قالبِ خاکی سے جُدا ہو کر زندہ رہتا ہے۔

(۵) :— اس عالمِ مادیات میں بھی یہ قانونِ قدرت ہے کہ جو جسم جتنا زیادہ کثیف ہے وہ اتنا ہی کم طاقت اور جلد فنا ہونیوالا ہے اور جو جسم جتنا زیادہ لطیف ہے اس میں اتنی ہی زیادہ طاقت و پائیداری ہے۔

موالیدِ ثلاثہ حیوانات، نباتات و جمادات کو دیکھئے، یہ کس قدر جلد فنا ہو جاتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں بسائط اور نیراتِ سماوی، چاند، سُورج وغیرہ کو دیکھئے کہ ان میں بقاء کی کس قدر طاقت ہے۔

پس جب اجسامِ لطیفہ میں اتنی بقاء ہے، تو عالمِ مجرّدات رُوحانیات میں کس قدر قوتِ بقاء ہوگی اور اس کی چیزیں کتنی دیر تک باقی رہ سکتی ہیں؟ اندازہ کر لیجئے!

(۶) :— قُدرت نے موجودات کے ہر ہر ذرّہ میں تاثیر ودیعت کی ہے۔

پس جس طرح اجسام میں تاثیر ہے اِسی طرح علوم و افعال میں بھی تاثیر ہے اور اس تاثیر سے رُوحِ لطیف متاثر ہوتی ہے۔

(۷) :— موجودہ مادی عالم میں جسم "رُوح" کے لئے ایک قسم کی قید ہے جو اس کے ادراک و احساس میں مانع ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود ادراک کا کام رُوح ہی انجام دیتی ہے۔

پس جب یہ رُوح جسم کی قید سے آزاد ہو جائے گی تو اس میں ادراک کی قوت بڑھ جائے گی اور پھر نیک و بد اعتقادات اور اعمالِ خیر و شر کی تاثیرات کو بدرجۂ اتم محسوس کرے گی۔ یہی حقیقت ہے برزخ یعنی قبر کے عذاب و ثواب کی۔

(۸) :— حواسِ انسانی کی دسترس کثیف اجسام تک ہے، لطیف اجسام کا ادراک بھی حواس کی طاقت سے باہر ہے، پھر عالمِ مجرّدات یعنی روحانیات کا ادراک حواس کیسے کر سکتے ہیں۔

(۹) :— عالمِ جسمانیات میں کثافت کے باعث اثر و تاثیر کی صفت بہت ضعیف ہے، لیکن باوجود اس کے صورتِ حال یہ ہے کہ لوہے پر جب آگ کی حرارت کا اثر پڑتا ہے تو لوہا خود آگ بن جاتا ہے۔

اِس کے مقابلہ میں مجرّدات میں لطافت کے باعث اثر و تاثیر کی صفت بہت قوی ہے۔

اِس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ رُوحِ لطیف پر جب انوارِ حق متجلی ہوتے ہیں تو اس کی لطافت، نورانیت اور طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

رُوح کے متعلق یہ چند مسلّم حقیقتیں ذہن میں رکھئے، پھر آگے بڑھیئے:—

آخرت کا عذاب و ثواب
عالمِ برزخ، عالمِ قرار

قبر کا عذاب اور ثواب برحق ہے۔ یہ اسلام کا مسلّمہ عقیدہ ہے، اِس عقیدے کی بُنیاد اِسی حقیقت پر قائم ہے، کہ موت کے بعد مومن اور کافر دونوں کی رُوحیں زندہ رہتی ہیں۔

جسم سے ظاہری مفارقت اور ظاہری علیحدگی کے بعد رُوحِ انسانی کہاں جاتی ہے؟ — جہاں جاتی ہے اس جگہ کا نام "برزخ" ہے۔ عالَمِ برزخ کیا ہے؟ —

موت کے بعد جو زندگی شروع ہوتی ہے اُسے قرآن پچھلی زندگی (حیاتِ آخرۃ) اور پچھلا گھر (دارِ آخرۃ) کہتا ہے۔

پچھلی زندگی کے دو حصے ہیں:—

(۱) شخصی موت سے لے کر اجتماعی موت تک کا درمیانی وقفہ، اسے عالمِ برزخ کہتے ہیں۔

(۲) پورے جہاں کی اجتماعی موت اور پھر حشر و نشر سے لیکر ابد تک اسے عالمِ قرار کہتے ہیں۔

یہ وضاحت تو رُوح کی جائے قیام کے بارے میں تھی۔

اب رہا یہ سوال کہ جسم رُوح سے ظاہری بے تعلقی کے بعد کہاں جاتا ہے؟ تو یہ ظاہر ہے کہ اسے قبر کے حوالہ کیا جاتا ہے لیکن قبر سے مراد صرف زمین کا گڑھا نہیں ہے بلکہ ہر وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی جگہ حاصل کرتا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے چار گھر بیان کئے ہیں، جن میں سے ہر گھر پہلے گھر سے بڑا اور وسیع ہے، فرماتے ہیں:۔

(۱) پہلا گھر ماں کا پیٹ ہے، یہ گھر نہایت تنگ اور تاریک ہے۔

(۲) دوسرا گھر دُنیائے عمل و کسب ہے، جس میں انسان ماں کے پیٹ سے نکل کر موت تک رہتا ہے اور خیر و شر کماتا ہے یہ گھر پہلے گھر سے بڑا اور وسیع ہے۔

(۳) تیسرا گھر عالمِ برزخ ہے، یہ گھر دُنیا سے اتنا ہی بڑا ہے، جتنی دُنیا ماں کے پیٹ سے بڑی ہے۔

(۴) چوتھا گھر عالمِ قرار ہے، وہ جنت ہے یا دوزخ، یہ وہ آخری گھر ہے جہاں خدا تعالےٰ انسان کو منزل بہ منزل پہنچاتا ہے، اور جگہ عطا فرماتا ہے جس کا انسان فی الواقع اہل ہوتا ہے[1]

موت کے بعد جسم اور رُوح کا تعلق

اوپر کہا گیا ہے کہ "موت" رُوح اور جسم کی ظاہری مفارقت کا نام ہے "ظاہری" اس لئے کہا گیا ہے کہ سلف امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موت کے بعد رُوح کا اپنے قالب کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے، قالب یعنی جسم کسی حالت میں بھی ہو۔

ابن قیم لکھتے ہیں:۔

سلف کا مذہب ہے کہ موت کے بعد انسان کو جو راحت یا اذیت پہونچتی ہے وہ رُوح اور جسم دونوں کو پہونچتی ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ رُوح تو براہ راست ثواب، یا عذاب میں مبتلا ہوتی ہے اور جسم رُوح کے واسطہ سے متاثر ہوتا ہے، البتہ جب قیامت قائم ہوگی تو پھر ارواح کو جسموں میں لوٹا دیا جائے گا، اور جسم اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔[2]

حاصل یہ نکلا کہ مومن ہو یا منکر سب کی رُوحوں کا اپنے جسموں کے ساتھ (وہ جسم کسی شکل میں بھی ہوں) تعلق و رابطہ رہتا ہے اور اسی رابطہ کی وجہ سے وہ جسم "رُوح" پر طاری ہونے والے عذاب و ثواب کا مزہ چکھتا ہے۔

دُنیا، برزخ اور قیامت تینوں عالموں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ

(۱) عالمِ دُنیا میں جسم نمایاں ہے اور رُوح پوشیدہ، اس لئے راحت و اذیت کی کیفیات براہ راست جسم پر طاری ہوتی ہیں اور بالواسطہ رُوح پر۔

(۲) عالمِ برزخ میں رُوح نمایاں ہوتی ہے اور جسم پوشیدہ اس لئے وہاں رُوح پر بالذات راحت و اذیت طاری ہوتی ہے اور جسم پر بالواسطہ

(۳) عالمِ قیامت میں رُوح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے۔ اس لئے وہاں دونوں براہ راست مبتلائے عذاب و ثواب ہوں گے۔

اس موقعہ پر ایک اور شبہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے الفاظ میں اس کا جواب ملاحظہ کیجئے:۔

اگر کوئی شبہ کرے کہ ہم مدت تک مُردہ کو قبر میں پڑا ہوا دیکھتے ہیں اور اس پر نظر رکھتے ہیں، لیکن نہ ہمیں عذاب نظر آتا ہے نہ ثواب، پس جو بات اپنے مشاہدہ کے خلاف ہو اس کا کیسے یقین کیا جائے؟،

اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں پڑے ہوئے مُردہ پر عذاب اور ثواب برحق ہے۔ لیکن ہماری آنکھ ملکوتی اُمور کے مشاہدہ سے قاصر ہے۔

صحابۂ کرام کو دیکھو، اُنھیں وحی کے آنے اور جبریل کے اُترنے کا یقین تھا، حالانکہ اُنہوں نے کبھی جبریل اور وحی کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، پس اگر کسی کو اس پر شبہ ہے، تو وہ پہلے فرشتوں

[1] کتاب الروح صـ ۱۸۵ ۔ [2] ایضاً صـ ۷۲ ۔

اور وحی پر اپنے ایمان کو پختہ کرے، اس کا تو اصل ایمان ہی کمزور ہے۔

ہاں! اگر کوئی مثال سے قبر کے عذاب و ثواب کو سمجھنا چاہے تو اُسے سونے والے پر غور کرنا چاہئے۔

سونے والے کو اچھے اچھے خوابوں سے راحت پہنچتی ہے اور بُرے اور خوفناک خوابوں سے تکلیف۔

وہ اچھے اچھے کھانے کھاتا ہے، باغوں کی سیر کرتا ہے، اس سے اُس کو راحت و خوشی محسوس ہوتی ہے۔

سانپ، بچھو اُسے کاٹتے ہیں، کوئی مارتا ہے، اس سے اُسے تکلیف محسوس ہوتی ہے، حالانکہ ہم اُس کے پاس بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا، خواب دیکھنے والا بعض اوقات چونک پڑتا ہے، چلا اٹھتا ہے، پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے، وہ تو اتنا محسوس کرتا ہے مگر ہمیں نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ کچھ احساس ہوتا ہے۔

پس اگر اس سونے والے پر طاری ہونے والی کیفیات کا ہم انکار نہیں کر سکتے، تو پھر برزخ کے رُوحانی عالم میں پیش آنے واقعات کا کیسے انکار کر سکتے ہیں؟[1]

اس مسئلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انبیاء علیہم السلام کو ادراک و احساس کی وہ قوت عطا فرمائی جس سے وہ عالم روحانیات کی چیزوں کو دیکھتے محسوس کرتے تھے، فرشتوں کو دیکھتے تھے، مُردے پر نازل ہونے والے عذاب و ثواب کو دیکھتے تھے، تو وہ اسی طرح اپنے عام بندوں کو بھی وہ قوت ادراک عطا فرما سکتا تھا، آخر انہیں کیوں محروم کر دیا؟۔

علامہ ابن قیم اس کا جواب دیتے ہیں:۔

اگر ایسا ہو جاتا تو ایمان و اقرار کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا اصل ایمان تو وہی ہو جو بن دیکھے حقائق پر لایا جائے۔

یہ عالم "دار الامتحان" ہے، دار الجزاء نہیں ہے، امتحان و آزمائش کے عالم میں عالم جزاء سے پردہ ہٹا دیا جاتا تو امتحان و آزمائش کی بات ہی کیا رہ جاتی۔[2]

ایک سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ جب ایک جسم خاکی آگ میں جل جلا کر خاک میں مل جاتا ہے اور اس کی خاک کے ذرّے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں، تو پھر اسے عذاب و ثواب کیسے پہنچتا ہے؟۔

اس کا جواب بھی علامہ ابن قیم سے سُنئے!

جسم خاکی کے متفرق اجزاء کے ساتھ رُوح کا اتصال و تعلق کیا مشکل ہے، اور اس تعلق کی وجہ سے ان اجزاء میں اذیت و لذت کا شعور کیا بعید ہے۔

کیا جمادات میں ادراک و شعور کا ہونا (خاص کر موجودہ سائنٹیفک دور میں) ایک مسلمہ حقیقت نہیں ہے؟۔

پس جب ان اجسام (جمادات) میں ادراک ثابت ہے جن کے ساتھ رُوح انسانی کا کبھی تعلق نہیں رہا، تو ان اجسام میں احساس و ادراک بدرجہ اولیٰ موجود ہونا چاہئے جن میں رُوح انسانی مدت تک ساری رہی ہو اور مفارقت کے بعد بھی تعلق باقی ہو۔[3]

برزخ کے عذاب و ثواب پر چند نصوص

جسم سے مفارقت کے بعد رُوح زندہ رہتی ہے، مومن کی رُوح ہو یا کافر کی، اور ہر رُوح کا تعلق اپنے جسم خاکی کے ساتھ قایم رہتا ہے۔

اس پر چند نصوص ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ما من مسلم یمر علی قبر اخیہ، کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا رد اللہ علیہ روحہ حتی یرد علیہ السلام۔	"جب کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے جسے وہ دُنیا میں جانتا تھا اور جا کر اُسکو سلام کرتا ہے تو خدا تعالیٰ صاحب قبر کی رُوح کو اس پر لوٹا دیتا ہے اور پھر وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے"

(۲) سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مقتولین بدر کی لاشوں پر کھڑے ہوئے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب عالم مثال۔

[2] روح ص۱۱۰ و ص۱۱۱، [3] کتاب الروح ص۱۱۵۔

جو کنوئیں کے اندر بھر دی گئی تھیں، اور ایک ایک لاش کا نام لے کر فرمایا:۔ "کیا اب بھی تمہیں معلوم ہوا یا نہیں، کہ خدا تعالٰے کا وعدہ سچا ہے، میں نے تو اللہ کے وعدے کی سچائی کو دیکھ لیا"۔

حضرت عمرؓ نے لاشوں کو مخاطب کرنے پر تعجب کا اظہار کیا اور حضورؐ سے سوال کیا، آپ نے فرمایا:۔

والذی بعثنی بالحق ما انتم باسمع لما اقول منھم ولکنھم	"قسم ہے اُس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا، تم میری بات کو ان مُردوں سے زیادہ نہیں سُنتے لیکن یہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے"

یعنی جتنا تم سُنتے ہو اتنا ہی یہ سُنتے ہیں

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"مُردہ ان لوگوں کے جوتوں کی آواز بھی سُنتا ہے جو مُردہ کو دفن کر کے لوٹتے ہیں"۔

قبروں پر جانے والوں کے لئے یہ مسنون قرار دیا گیا کہ وہ "السلام علیکم یا دار قوم مومنین" کہا کریں۔

ارشاد فرمایا:۔

"جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے، اور وہاں جا کر بیٹھتا ہے تو صاحب قبر کو اس سے راحت محسوس ہوتی ہے"۔

حضرت عمرو ابن العاصؓ نے آخر وقت میں اپنی اولاد کو وصیت فرمائی:۔

"مجھے دفن کرنے کے بعد میری قبر پر اتنی دیر ٹھیرنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ تمہارے ٹھیرنے سے مجھے طمانیت و راحت محسوس ہو"

سرورِ عالم کا دو قبروں پر گذرنا اور یہ فرمانا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے احتیاط نہیں کرتا تھا، اور دوسرا چغل خور تھا"۔ مشہور واقعہ ہے۔ علامہ ابن قیم کتاب الروح میں اس باب کی احادیث، آثار صحابہ و تابعین نقل کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مُردہ قبر پر آنے والے کو پہچانتا ہے اور اُس سے اسے خوشی ہوتی ہے"۔

آگے لکھتے ہیں:۔ یہ سلام، نداء اور خطاب اسی چیز کے لئے ہوتا ہے جو موجود ہوتی ہے، سُنتی ہے اور سمجھتی ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔ رُوحیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔

مبتلائے عذاب رُوحیں:۔ یہ تکلیف و اذیت میں گرفتار ہوتی ہیں اس لئے انہیں آپس میں ملنے کی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔

مرحوم روحیں:۔ یہ آزاد ہوتی ہیں، آپس میں ملتی جلتی ہیں دُنیا اور اہل دُنیا کا ذکرِ خیر کرتی ہیں۔

نیک رُوحوں کی ملاقات اور رفاقت قرآن سے ثابت ہے۔ فاولئٰک مع الذین انعم اور:۔ وحسن اولئٰک رفیقاً۔

اِس باب کی ایک حدیث بھی مُلاحظہ ہو:۔

ابو ایوب انصاریؓ روایت فرماتے ہیں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا "ایک مسلمان کی جب وفات ہوتی ہے تو رحمت کے فرشتے اس کے عزیزوں سے کہتے ہیں، جاؤ! اپنے بھائی کو دیکھو تاکہ اسکی وحشت دور ہو پھر اس کے عزیز اس سے دُنیا والوں کا حال پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ ایک شخص کے متعلق پوچھتے ہیں تو وہ جواب دیتا ہے کہ اُس کی تو وفات ہو چکی، اس کے عزیز کہتے ہیں:۔ انا للہ وانا الیہ راجعون وہ جہنم میں ڈال دیا گیا، بُری ہے وہ جگہ"۔

برزخ اور رُوحوں کے متعلق مختلف حالات کی تفصیل دیکھنے کے لئے علامہ سیوطی کی شرح الصدور، امام قرطبی کے تذکرہ اور ابن قیمؒ کی کتاب الروح کی طرف رُجوع کرنا چاہیئے۔

اِس تمہیدی وضاحت کے بعد یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ موت کے بعد زندگی کی جو نوعیت ہے (قطع نظر عذاب و ثواب کے) اسکے لحاظ سے سب زندہ ہیں، کافر بھی، مومن بھی۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب زندگی اس نوعیت میں سب برابر ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں صرف انبیاء علیہم السلام اور شہیدوں کو زندہ کہا گیا ہے اور انہیں مُردہ کہنے کی ممانعت آئی ہے، آیئے قرآن حکیم سے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش......

(باقی آئندہ)

قسط نمبر ۲:-

حیاتِ اُخروی کے مختلف مظاہر

(مولانا اخلاق حسین قاسمی الدہلوی فاضل دیوبند)

قرآنِ حکیم اور حیات

قرآن حکیم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن موجودہ زندگی میں بھی اُسی شخص کو زندہ کہتا ہے جو زندگی کے اصل مقصد کو پورا کرتا ہے، وہ لوگ قرآن کی زبان میں مُردہ ہیں جو زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل ہیں۔

انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں یوں سمجھیئے کہ وہ مقصد ہے ــــ عبادتِ خالق اور خدمتِ خلق۔

اس سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ ہوں:-

(۱) یاایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔ (انفال)
"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلاوے تمکو ایک کام پر جسمیں تمہاری زندگی ہے۔"

یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمۃ کا ہے، شاہ صاحب نے "لما" کے لام کو الیٰ کے معنی میں لیا ہے۔ وہ چیز کیا ہے جس کی طرف رسول اللہ بلاتے ہیں؟

قتادہ فرماتے ہیں:- وہ قرآن حکیم ہے، اس میں نجاۃ ہے، بقاء ہے، زندگی ہے۔

سدی کہتے ہیں:- کفر نے ان کو مردہ کر دیا تھا اسلام اُن کو زندہ کرنے آیا۔

حضرت امام ولی اللہ الدہلوی رح نے اپنے فارسی ترجمہ میں قرآن کی مراد واضح کر دی، فرماتے ہیں:-

برائے آنکہ زندہ دل سازد شمارا۔
"اسواسطے کہ تمہیں زندہ دل بنادے۔"

(۲) وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔
اور برابر نہیں جیتے نہ مردے (فاطر)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:- زندوں سے مراد مومنین، اور مُردوں سے مراد کفار ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے یہ مثال بیان فرمائی ہے۔

(۳) اومن کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس۔ (انعام)
"بھلا ایک شخص کہ مُردہ تھا پھر ہمنے اسکو زندہ کیا اور دی اسکو روشنی کہ لئے پھرتا ہو لوگوں میں"

یہ اُس شخص کی حالت بیان فرمائی ہے جو پہلے مُردہ تھا پھر اللہ تعالےٰ نے اُسے ایمان کی توفیق دیکر زندہ کر دیا (ابن کثیر)

(۴) اسی مناسبت سے اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم کو "روح" فرمایا ہے۔

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا (شوریٰ)
"اور اسی طرح بھیجا ہمنے تیری طرف قرآن اپنے کلام میں سے۔"

ہم نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا ترجمہ اختیار کیا ہے جو عام مفسرین کی رائے کے مطابق ہے۔

ابن قیم کہتے ہیں:- وحی کو روح اس لئے کہا گیا کہ وحی سے دلوں کو زندگی ملتی ہے، ارواح کو حیات نصیب ہوتی ہے۔

(۵) من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن
جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت ہو اور وہ یقین پر ہو

فلنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ۔ (نحل)

تو اس کو ہم جلد دیں گے ایک اچھی زندگی"

نیک علمی ہی کی بدولت ستھری زندگی نصیب ہوتی ہے، اور وہی زندگی صحیح معنی میں زندگی کہلانے کی مستحق ہے۔ جو زندگی ستھری اور پاکیزہ نہ ہو وہ حیوان کی زندگی تو ہو سکتی ہے انسان کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

حسن، مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں:۔ کامل درجہ کی پاکیزہ زندگی صرف جنت ہی میں عطا ہوگی۔ اور یہ اُسی کو ملے گی جو دنیا میں اپنی زندگی کو پاکیزہ رکھے گا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:۔

"من کانت حیاتہ بنفسہ یکون مماتہ بذھاب روحہ و من کانت حیاتہ بربہ فانہ ینتقل من حیاۃ الطبع الی حیاۃ الاصل وھی الحیوٰۃ الحقیقیۃ۔" (روح البیان ج ۴ ص ۱۳۵)

"مطلب یہ ہے کہ جس کی زندگی اپنے نفس سے ہے تو اس کی موت تو صرف رُوح نکل جانے سے ہی واقع ہوجاتی ہے، اور جس کی زندگی اپنے رب سے ہے تو وہ طبعی حیات سے اصلی حیات کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، جو حیات حقیقیہ ہے۔"

اب آخرۃ کے پچھلے گھر کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر معلوم کیجئے مجرمین کے متعلق فرمایا۔

انہ من یأت ربہ مجرماً فان لہ جھنم لا یموت فیھا ولا یحییٰ۔ (طٰہٰ)

"بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا اپنے رب کے پاس گناہ لیکر سو اس کے واسطے دوزخ ہے نہ مرے اس میں نہ جیے"

الذی یصلی النار الکبریٰ ثم لا یموت فیھا ولا یحییٰ۔ (اعلیٰ)

"وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں پھر نہ مریگا اسمیں نہ جیے گا"

شہداء کے متعلق فرمایا:۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتاً، بل احیاءٌ عند ربھم۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اُنہیں مُردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے پاس"

اِن آیتوں کو سامنے رکھکر ہر شخص آسانی کے ساتھ اس بات کو سمجھ سکتا ہے:۔

(۱) قرآن اُس شخص کو زندہ سمجھتا ہے جو روحانی اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرکے اپنے جوہر انسانیت کو زندہ رکھتا ہے۔

(۲) وہ شخص قرآن حکیم کے نزدیک مُردہ ہے جو نفسانی اور حیوانی خواہشات کے پیچھے پڑکر اپنی اخلاقی حس اور رُوحانی صلاحیت کو برباد کردیتا ہے۔

پچھلے گھر کی زندگی چونکہ اسی پہلے گھر کی زندگی کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لئے قرآن وہاں کے رہنے والوں میں بھی اُن ہی کو زندہ کہکر یاد کرتا ہے جو اپنی رُوحانیت کو صحیح سلامت بچاکر لیجاتے ہیں اور اُنہیں مُردوں میں شمار کرتا ہے جو ایک بے جان اور تاریک رُوح کے ساتھ اِس عالم کو چھوڑتے ہیں۔

قرآن حکیم قانون واحکام کی بحثوں میں تو موت وحیات کے الفاظ کو بلاشبہ طبعی مفہوم میں استعمال کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ جب وہ ہدایت اور سعادت کی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے تو اس وقت موت وحیات کا وہی مفہوم مراد لیتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔

اصل مسئلہ حیات النبی

قرآن حکیم نے صرف شہداء کے متعلق تصریح کی ہے کہ وہ زندہ ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ اور کوئی اس عزت سے سرفراز نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب شہداء زندہ ہیں تو انبیاء اور صدیقین بدرجۂ اولیٰ زندہ ہیں کیوں کہ قرآن حکیم نے نعمت پانے والے بندوں کی حسب ذیل ترتیب قائم کی ہے:۔

"من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین"

اسی ترتیب سے یہ حضرات، آخرۃ میں حیاۃ حقیقی کی دولت پاتے ہیں۔

مقام انبیاء۔ اعلیٰ علیین

انبیاء علیہم السلام حیات ہیں حیات کے سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز ہیں خصوصاً

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے متعلق "حیات النبی" پوری اُمت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے صرف حضور کے لئے "حیات النبی" کی صفت مشہور و مسلّم ہے؟

خصوصیت ملاحظہ کیجئے:-

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدمت خلق اور عبادت خالق دونوں منصبوں میں سب سے بلند درجہ حاصل تھا۔

ہر لمحہ بندگان الٰہی کی ہدایت اور فلاح کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول رہتی تھی اور حق کی طرف بھی۔

خلق کی طرف توجہ فرمانے سے حق کی توجہ کم نہیں ہوتی تھی، اور حق کی توجہ ادھر کی توجہ کو کمزور نہیں کرتی تھی۔

آپ کے دل میں خلق کی ہدایت کے لئے جو لگن تھی اُس کا حال یہ تھا کہ خود حق تعالےٰ کو اظہار ہمدردی کے طور پر یہ کہنا پڑا تھا

فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم ان لم یومنوا بھذا الحدیث اسفا۔ (کہف)

"سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دیدیں گے۔"

توجہ الی الخلق کا کمال ہے جو قرآن نے یہ فرمایا کہ:-

عزیز علیہ ما عنتم۔ (توبہ) "بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے"

توجہ الی الحق میں جو آپ کا درجہ تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ معبود حقیقی نے آپ کو جب پکارا "عبد" یعنی بندہ کامل کہہ کر پکارا، اور اسی کو آپ کی صفت خاص قرار دیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ حق کی توجہ اپنے بندے پر اس درجہ مرکوز رہنے لگی کہ قرآن نے اعلان کیا کہ اے نبیؐ! آپ بیٹھتے اُٹھتے ہر حال میں، ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔

الذی یراک حین تقوم و تقلبک فی الساجدین (شعراء)

"جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تو اُٹھتا ہے اور تیرے پھرنے کو نمازیوں میں"

وہ دیکھتے سب کو ہیں، لیکن اس اعلان میں اپنی خصوصی توجہ کا اظہار فرمایا ہے۔

ہر لمحہ خلق کی طرف بھی کامل توجہ اور حق کی بھی پوری لگن۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ حضور ہر کام میں، ہر فعل میں، کھانے میں، پینے میں، یہاں تک کہ بیوی کے ساتھ تعلق میں بھی صرف حق کی خوشنودی کو پیش نظر رکھتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام ہی خلق کی طرف کامل توجہ کیوں فرماتے ہیں اور یہ مقام کسی دوسرے داعیٔ حق کو کیوں حاصل نہیں ہوتا؟ اس کی وجہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصوف کی زبان میں سُنیئے!:-

فرماتے ہیں:-

حضرات انبیاء کی توجہ خلق کی طرف کامل طور پر اس لئے مبذول ہوتی ہے:-

"کہ اُن کا خلق کی طرف نزول "عروج الی الحق" کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد ہوتا ہے، بخلاف ولی کے، ولی چونکہ عروج کی تمام منزلیں طے کئے بغیر نزول کرتا ہے اس لئے ہر وقت اُوپر کی نگرانی کا فکر لگا رہتا ہے اور یہ فکر خلق کی ہدایت کی طرف کامل توجہ کرنے میں مانع ہوتا ہے"

(مکتوب نمبر ۲۶ دفتر اوّل)

توجہ الی الخلق کے ساتھ ساتھ توجہ الی الحق کے کمال کا ایک منظر اس موقعہ پر سامنے رہے تو بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر اور عبید اللہ ابن عمیر حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ام المومنین بولیں "عبید اللہ کہاں تھے؟ تم نے آنا کم کیوں کر دیا؟" عبید اللہ نے عرض کیا "ام المومنین! کسی نے کہا ہے:- "زر غبا تزدد حبا" کبھی کبھی ملنا چاہیئے، تاکہ محبت زیادہ ہو" فرمایا "میں تو اسی کو پسند کرتی ہوں کہ تم روزانہ میرے پاس آیا کرو" یہ گفتگو چل رہی تھی کہ عبداللہ نے بات کاٹ کر کہا، "ام المومنین! چھوڑیئے اس مذاق کو اب ہماری سُنیئے، آج آپ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی عجیب واقعہ سُنایئے، ہم اسی لئے حاضر ہوئے ہیں۔"

حضرت صدیقہ یہ سُنکر رونے لگیں، فرمایا، ان کی زندگی کا تو ہر واقعہ عجیب ہے، کیا کیا سُناؤں، اچھا، ایک رات کا قصہ سنو! :-

"ایک روز میری باری کے دن آپ گھر تشریف لائے، باتیں چیتیں کیں پھر لیٹ گئے، بستر پر ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ حضورؐ کا جسم مطہر میرے جسم سے لگ رہا تھا۔

لیٹے لیٹے آپ نے فرمایا، عائشہ! مجھے اجازت دو کہ میں کچھ دیر اللہ کا ذکر کروں، میں نے عرض کیا حضور! میں اجازت دوں؟ توبہ توبہ آپ کی مرضی میں میری مرضی، ضرور اللہ کا ذکر کیجئے۔

آپ کھڑے ہو گئے، قرآن کی تلاوت کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، بیٹھ کر بھی روئے، پھر لیٹ گئے سیدھی کروٹ پر، رُخسار کے نیچے ہاتھ رکھ لیا، آپ کے آنسو بہہ رہے تھے"! (ابن کثیر آلِ عمران)

آپ سمجھے کہ اس واقعہ کو حضرت صدیقہ نے سب سے زیادہ عجیب کیوں سمجھا؟ واقعہ کا عجیب پہلو یہ ہے کہ ایک شوہر اپنی جوان العمر چہیتی بیوی کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتا ہے، قریب سے قریب ہو جاتا ہے، یہ سفلی جذبات میں ڈوب جانے کا وقت ہوتا ہے، ایسے ماحول میں ذکر الٰہی کا تصور کیا؟ لیکن یہی وہ کمال ہے تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ کا کہ عین اس حالت میں بھی ذکرِ الٰہی کا شوق بھڑک اٹھتا ہے اور بستر چھوڑ چھاڑ کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

یہی پہلو تھا اس واقعہ کا عجیب ترین۔

پس جس طرح دُنیا کی زندگی میں آپ حق کے ساتھ ساتھ خلق کی طرف بھی پوری توجہ فرماتے تھے اِسی طرح اس عالم سے پردہ فرمانے کے بعد تجلیات حق کے سب سے بلند مقام پر پہنچکر بھی خلق کی طرف توجہ فرما رہے ہیں۔ نیز ختم نبوت حضورؐ کا خصوصی منصب ہے اس منصب کا تقاضا ہی کہ قیام ہدایت کے لیے آپ کی کامل توجہ اس عالم کی طرف مبذول ہے اور جوں جوں آپ کا استغراق ربانی تجلیات کے مشاہدہ میں بڑھتا جائے دوں دوں آپ کی توجہ اِس عالم کی طرف بھی زیادہ ہوتی جائے۔

یہ آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دور میں بلا کسی لالچ و طمع کے ہزاروں اللہ کے بندے خُدا کی وحدانیت کو قبول کر لیتے ہیں اور یہ بھی آپ ہی کا رُوحانی تصرف ہے کہ قومی تعصبات کے گھُپ اندھیروں میں اللہ کے بندے شعوری یا غیر شعوری طور پر حضورؐ کی پھیلائی ہوئی توحید اور اخوت و مساوات کی روشنی کے قریب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اِس کو بھی آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ کہنا چاہیے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی حق کے متوالوں کی ایک جماعت اعلاءِ کلمۂ حق کے لئے قایم رہتی ہے، جو نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کرتی ہے نہ کسی قسم کے لالچ و طمع میں آتی ہے۔

یہ جماعت ہے علماءِ حق کی ————

پس جو ہادیِ برحق دُنیا کی ظاہری آنکھوں سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی نوعِ انسانی کی ہدایت کی طرف توجہ فرما رہے ہیں جن سے دُنیا کی رُوحانی زندگی برقرار ہے یقیناً وہی — حیات النبی کہلانے کے مستحق ہیں۔

وہ زندہ ہیں کیوں کہ اُن کی توجہ سے زندگی برقرار ہے۔

وہ حیات ہیں کیوں کہ اُن کے تصرف سے حیاتِ رُوحانی کی تابانیاں باقی ہیں۔

علماء نے روشن آفتاب کی مثال سے اس حقیقت کو سمجھایا ہے اِس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں :-

(۱) ہر آن و ہر لمحہ آپ کی توجہ دونوں طرف کامل ہے، حق کی طرف بھی اور خلق کی طرف بھی۔

(۲) ہدایت کا جو نُور اپنی توجہ سے آپ عالم کو عطا فرما رہے ہیں وہ آپ کا ذاتی نہیں، نُورِ حقیقی کی تجلی ہی، جو آپ کے واسطے سے عالمِ خلق پر برس رہی ہے۔

دیکھئے! قرآنِ حکیم نے اس کی طرف کتنا لطیف اشارہ کیا ہے :-

فبما رحمۃ من اللّٰہ لنت لھم۔ "یعنی اے رحمت عالم! آپ کی ذات چونکہ رحمانی تجلیات کا مظہر اتم ہے اس لئے بندگانِ الٰہی آپ کے قلب مبارک میں اپنے لئے بے پناہ جذبہ محبت و شفقت پاتے ہیں"

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو آخرت کی زندگی میں قربِ الٰہی اور تجلی ربانی کا جو بلند مقام حاصل ہے اس کی وضاحت لفظوں کے ذریعہ جس قدر ممکن ہو سکتی ہے وہ اربابِ علم و تصوف کی اصطلاحات میں اوپر بیان کی گئی۔ ورنہ وہ عالم ملکوت جسکے متعلق وحی الٰہی نے یہ فرمایا ہو:۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (سجدہ) "سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا رکھی ہے ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک"

اُس کے بلند ترین مقامات کی حقیقت تک رسائی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی حیات ہیں اور اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے مقامات قرب و تجلی میں توجہ الی الحق اور توجہ الی الخلق میں مصروف و مشغول ہیں۔

حضورؐ نے معراج کے موقعہ پر ان ہی مقامات پر ان حضرات سے مُلاقات فرمائی اور خود اپنی ہمت کے مطابق آگے بڑھتے چلے گئے۔

رہا حضرات انبیاء کے مقدس اجسام کا معاملہ تو چوں کہ حضرات انبیاء کی رُوحیں نہایت قوی ہوتی ہیں ـــ اس قدر قوی کہ وہ اپنے قالبوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں اس لئے انہیں عام خاکی اجسام پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔

مقامِ صدیقین
مقامِ صدق

نبی کے بعد صدیق کا مقام ہے۔ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

جسے باطنی معارف اور ظاہری شریعت کا کامل علم ہو، وہ صدّیق ہے، نبی اور صدیق کے علوم میں وحی اور الہام کا فرق ہوتا ہے۔

صدیق بھی زندہ ہیں، نبی کے بعد خلق کو ہدایت کا فیض سب سے زیادہ ان ہی سے پہنچتا ہے، ان ہی کے قلوب انوارِ نبوت کو براہِ راست قبول کرتے ہیں اس لئے اولیاء اللہ میں حیات کا سب سے بلند مقام انہیں ہی حاصل ہوتا ہے۔

اُن کی پاک رُوحوں کا مسکن "مقعد صدق" ہے:۔

فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر۔ "ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس"

ام کبشہ نے حضورؐ سے ارواح مومنین کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہیں۔

آپ نے فرمایا:۔

"مومنوں کی ارواح سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں، جو جنت میں کھاتے پیتے پھرتے ہیں اور اُن قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں جو عرشِ الٰہی کے نیچے معلق ہیں، وہ رُوحیں دُعا کرتی ہیں، خُداوندا! ہمارے بھائی بندوں کو ہم سے ملا دے اور اپنے وعدے کو پُورا فرما!"

یہ تمثیل ہے، مقصد یہ ہے کہ ارواحِ کاملین کو جنت میں سیر کرنے اور عرشِ الٰہی کے سایہ میں آنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔

حدیث میں صرف لفظ "مومنین" ہے، لیکن جو مقام بیان کیا گیا ہے چوں کہ وہ دوسرے تمام مقامات سے بلند ہے اس لئے ہم نے مومنین سے مومنین کاملین یعنی صدیقین مُراد لئے ہیں

مقامِ شہداء
فردوسِ اعلیٰ

شہید فی سبیل اللہ کا درجہ تیسرا ہے، لیکن یہ فضیلت صرف ان ہی کو حاصل ہے کہ قرآن کریم نے انہیں "زندہ" کہا ہے۔

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اللہ کی راہ میں مارے جانے والے چند باتوں میں انبیاء علیہم السلام پر فضیلت رکھتے ہیں، یعنی

(۱) شہیدوں کو غسل کی حاجت نہیں۔

(۲) امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق:۔

"یہ نماز جنازہ کے بھی محتاج نہیں"۔

(۳) قرآن میں آیا ہے، 'انھیں مُردہ نہ کہو'، اور انبیاء کو مُردہ کہا گیا ہے

لیکن یہ جزوی فضیلت ہے، انبیاء علیہم السلام کی کلی فضیلت میں اِس سے فرق نہیں پڑتا۔" (مکتوب ۱۲۲ دفتر سوم)

احادیث شہداء کا جو رُوحانی مقام بیان کرتی ہیں قریب قریب اس میں وہی تمثیل ملتی ہے جو اُوپر مذکور ہے۔ البتہ ان میں صراحت ہے شہداء فی سبیل اللہ کی اور دوسرا ایک فرق یہ ہے کہ:-

خدا تعالےٰ شہیدوں سے پوچھتا ہے:-

"کچھ اور چاہتے ہو؟"

وہ عرض کرتے ہیں 'خداوندا! سب کچھ ہے'۔

جب خدا تعالےٰ ان سے برابر پوچھے جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں "اچھا تو اے ہمارے رب! ہمیں ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دیجئے، تاکہ ہم تیری راہ میں پھر قتل ہوں"۔ لیکن چوں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف ہے، اِس لئے منظور نہیں کیا جاتا۔

ہم نے شہداء کے رُوحانی مسکن کا نام فردوس اعلیٰ رکھا ہے کیوں کہ حضرت ام حارثہ نے جب اپنے بیٹے کی شہادت کے بعد حضورؐ سے پوچھا کہ وہ کہاں ہوں گے تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا:-

"فردوس اعلیٰ میں"۔

مقروض شہداء باب جنت:

قرآن و حدیث میں شہداء کا جو مقام بیان کیا گیا ہے وہ صرف ان شہیدوں کا ہے جن پر دوسرے کا حق نہ ہو جو شہید مقروض ہوتے ہیں، ان کے متعلق سُنئے:-

ایک شخص نے کہا، حضور! اگر میں خُدا کی راہ میں مارا جاؤں تو مجھے کونسی جگہ ملے گی، فرمایا، جنت ملے گی، وہ شخص جب جانے لگا تو آپ نے اُسے پھر آواز دی، فرمایا:-

البتہ اگر اس کے ذمہ قرض ہوگا تو یہ بات نہیں ہوگی، مجھ سے جبرئیلؑ نے ابھی آکر یہ کہا ہے۔

ابن عباس کی روایت میں اسکی تفصیل ہے۔

ایسے شہداء جنت کے دروازہ پر رہتے ہیں، ایک سبز قبے میں وہیں ان کو صبح و شام جنت کی نعمتیں پہنچائی جاتی ہیں۔

مقام ابرار و صالحین، علیین

عام ابرار و صالحین کی رُوحوں کا جو مسکن بتایا گیا ہے وہ علیین ہے۔

اِس مقام کی بھی مختلف حالتیں ہیں:-

بعض مومن رُوحوں کے متعلق آتا ہے کہ جسم سے مفارقت کے بعد ملائکہ انہیں خدا کے حضور میں لے جاتے ہیں۔ وہ عرش الٰہی کے پاس خُدا کو سجدہ کرتی ہیں، سجدہ کے بعد خدا تعالےٰ حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کی رُوح کو عیش و مسرت کے باغات میں داخل کردو۔

بعض رُوحیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ملائکہ ساتویں آسمان پر لیجاکر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور یہی ان کا مقام ہوتا ہے

بعض رُوحیں جن میں ایمان و عمل کی طاقت بہت کم ہوتی ہے وہ اپنے خاکی جسموں کی آرام گاہوں کے آس پاس ہی رہتی ہیں، یہیں ان کو ان کی طاقت کے مطابق تجلی ربانی پہنچتی رہتی ہیں۔

بعض سات دن تک فشار قبر میں محبوس رہتی ہیں اور پھر انہیں ترقی اور علو نصیب ہوتا ہے۔

معذب رُوحیں

کفار و منکرین کی رُوحوں کو پستیوں میں مقید کردیا جاتا ہے۔ اُن کے لئے قرآن و حدیث میں جو لفظ آیا ہے وہ 'سجین' ہے، جس کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ وہ زمین کے ساتویں طبقہ میں ہے۔

مطلب یہ ہے، کہ کفر و انکار کی فطرت میں جو ظلمت و پستی ہے اُسی کے مطابق ان کی رُوحوں کو تاریکیوں اور پستیوں میں مقید کردیا جاتا ہے۔

اُن تنگ و تاریک جیل خانوں میں ان رُوحوں پر کفر و انکار کی سزا کے ساتھ ساتھ گناہوں کی مختلف سزائیں بھی مسلط کردی جاتی ہیں۔ گناہ گار مومن رُوحیں اپنے گناہوں کی ص

ص سزا پاتی ہیں، گناہوں کی تاریکی اور بوجھ ان کے لئے رکاوٹ ثابت ہوتا ہے اور وہ فشار قبر میں رُکی رہتی ہیں یعنی انکو ان کے گناہوں کی سزا ملتی رہتی ہے، صدقات جاریہ جن کی وہ بُنیاد رکھ جاتے ہیں یا زندوں ع